خواطر و سوانح

افاداتِ علامہ ابن جوزی

(از مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی)

شیطان کا ایک بہت بڑا فریب

(سلسلہ کے لیے اذیہ کا برہان دیکھیے)

موحدِ اعظم ابراہیم خلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام جن کی شانِ توحید کا وظیفۂ نیاز یہ تھا اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (۱) اور جنھوں نے خدا کی زمین پر صبر و توکل کے عظیم الشان ستون قائم کیے تھے کیا انھوں نے وسائل معیشت کو ترک کر دیا تھا؟ نہیں! اُن کے پاس دولت کا حصۂ وافر موجود تھا۔ اُن کی مالی حالت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اُن کے پاس مویشیوں کی اتنی کثرت تھی کہ اُن کے ضروری بندوبست کے لیے انہیں اپنے شہر میں جگہ کی تنگی محسوس ہوتی تھی، ایسے ہی اُن کے عزیز لوط علیہ السلام اور بہت سے دوسرے پیغمبر اور حضرت داؤد و سلیمانؑ کی سطوتِ شاہی سے تو کون واقف نہیں۔ پھر وہ جماعت مقدس جس نے اپنا سب کچھ اللہ اور اُس کے رسول کے لیے قربان کر دیا تھا کسبِ اکتساب اُس کی زندگی کا نشانِ امتیاز تھا صحابۂ کرامؓ تجارت کے لیے سفر کرتے، محنت اُٹھا کر دولت حاصل کرتے، معاش کے جتنے جائز اور حلال طریقے ہو سکتے ہیں بے تکلف اُن کو اختیار کرتے اور اپنے دست و بازو سے پیدا کی ہوئی دولت کی حفاظت کرتے یہاں تک کہ جب اُس کے لٹا دینے کا وقت آتا تو ایک لمحہ کے تأمل کے بغیر لٹا دیتے، غرضکہ جس چیز کو بہت سے نیک بخت بے وقوف اب توکل سمجھتے ہیں حضرات صحابہؓ

(۱) میں نے تو ہر طرف سے منہ موڑ کر اور توجہ ہٹا کر صرف اُسی ہستی کی طرف اپنا رُخ کر لیا ہے جو آسمان و زمین کی بنانے والی ہے۔

کے یہاں اُس کا نام تعطل تھا۔(۱)

صدیق اکبرؓ کا مستقل شغل تجارت تھا۔ آپ نبی کریم صلعم کی موجودگی میں تجارت کے لیے مختلف سفر

---

(۱) توکل کی حقیقت سمجھنے کے لیے حدیث ذیل کو پیش نظر رکھنا چاہیے، ارشاد ہے: "لو توکلتم علی اللہ حق توکلہ لرزقکم کما یرزق الطیر تغدو خماصاً وتروح بطاناً" یعنی اگر حق تعالیٰ پر تم کو اعتماد ہو اور تم اس پر اتنا ہی بھروسہ کرو جتنا ایک مخلوق اور ایک مرزوق کو اپنے خالق اور رازق پر کرنا چاہیے، تو تمہیں وہ اس طرح روزی پہنچائے جس طرح اُس پرندے کو پہنچاتا ہے جو روزی کی تلاش میں سویرے سویرے اپنے آشیانے سے خالی پوٹے اُڑتا ہے اور شام کو جب واپس آتا ہے تو اس حالت میں آتا ہے کہ اُس کے پوٹے بھرے ہوئے ہوتے ہیں، سبحان اللہ کیسی پاک تعلیم ہے جو لوگ توکل کے لفظ کو موقع بے موقع استعمال کرنے کے عادی ہیں اور اُس کی حقیقت پر غور نہیں کرتے، اس ارشاد مبارک میں اُن کی اصلاح و ہدایت کا بہت کچھ سامان موجود ہے۔

غور کرو فضائے آسمانی میں اُڑنے والے پرندے کے قبضہ و تصرف میں نہ تو غلّوں اور غذاؤں کے خزانے ہیں نہ پانی سے بھرے ہوئے حوض اور تالاب، تاہم وہ اپنا آشیانہ چھوڑتا ہے اور اس کیفیت کے ساتھ چھوڑتا ہے کہ غلّے کے ایک ایک دانے اور پانی کے ایک ایک قطرے کی اُسے جستجو ہوتی ہے۔ وہ فضاؤں میں اُڑتا پھرتا ہے یہاں تک کہ اُس کا رزق اس کے پاس پہنچ جاتا ہے اور وہ بھرے پیٹ اپنے بسیرے کی طرف لوٹتا ہے۔

تو دیکھیے پرندوں کے لیے قدرت نے یہ انتظام نہیں کیا کہ وہ اپنے آشیانوں میں پڑے روزی کا انتظار کرتے رہیں اور اُن کی روزی وہیں پہنچا دی جائے، بلکہ وہ رزق کی طلب میں نکلتے ہیں اور جب نکلتے ہیں تو فضاؤں میں غیب سے اُن کی روزی کا سامان کر دیا جاتا ہے۔ پھر جب جانوروں کے ساتھ یہ معاملہ ہے حالانکہ ان میں نہ تو کسب، اکتساب کی قوتیں ہیں نہ ادراک و تعقل کی عجوبہ کاریاں، پھر کیسے ممکن ہے کہ انسان جس کے اختیار و ارادہ اور ادراک و تعقل کی ہنگامہ خیزیوں سے زمینوں کی پستیاں اور آسمانوں کی بلندیاں دہل رہی ہیں، سعی و کوشش کی جگہ کسل و تعطل کی راہ اختیار کرے اور قدرت گھر بیٹھے اس کی روزی اُس کے قدموں میں ڈال دے۔ ایسا انسان یقیناً مجرمانہ غفلت کا مرتکب ہے اور اُسے اس ضعف و عجز اور خمول و کسل کی سزا ملنی چاہیے۔

مومن کی شان یہ ہونی چاہیے کہ اسباب و ذرائع کی صحیح تشخیص کے بعد عمل کی جس منزل میں قدم رکھے اس یقین کے ساتھ رکھے کہ اسباب و ذرائع کا اختیار کرنا میرا کام ہے اور ان میں اثر پیدا کرنا اُس قادر و توانا کا، وہ چاہے تو منٹ کے منٹ میں تمام اسباب کی قوت کھینچ لے، چاہے تو ایک معمولی اور ضعیف سبب کو تاثیر کی غیر معمولی قوتیں بخش دے۔ ہماری بڑی گمراہی یہ ہے کہ یا ہم گھر میں پڑے رہنے، عمل و سعی کی صلاحیتوں کو معطل کر دینے کو توکل کہنے لگتے ہیں یا ہمیں اپنے دماغ، اپنی ذکاوت، اپنی عقل اور اپنے اختیار کردہ طریق کار پر اس درجہ اعتماد ہو جاتا ہے کہ ہم خدا کو بھی بھول جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا مقصد حاصل نہیں ہوتا یا اُس میں غیر معمولی طوالت ہو جاتی ہے۔

مزید تشریح کا یہ محل نہیں۔

کرتے تھے۔ عبداللہ بن زبیرؓ اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے اپنے کاروبار اور اپنی جدوجہد کے نتیجہ کے طور پر دولت کی جو مقدار اپنے ترکہ میں چھوڑی تھی وہ تاریخ اسلام کی ایک معلوم و مشہور حقیقت ہے۔ ذی النورین کا تمول تمام صحابہؓ میں مشہور تھا۔ علی مرتضیٰؓ کے مالیہ کی نہیں صرف صدقہ کی مقدار چالیس ہزار تھی، مورخین کے یہاں مشہور صحابی ابن مسعودؓ کے ترکہ کا اندازہ نوّے ہزار ہے۔

خود ذاتِ قدسی صفات صلعم نے کعب بن مالکؓ سے ارشاد فرمایا:۔

أمسك عليك بعض مالك — اپنے مال کے ایک حصہ کو محفوظ رکھو

سعد بن ابی وقاصؓ کو مشورہ دیا۔

لان تترك ورثتك اغنياء خير من — اپنے وارثوں کو اس حال میں چھوڑنا کہ وہ مستغنی ہوں اور ان کے پاس گذر اوقات ان تترکھم عالة يتكففون الناس — کی کوئی صورت ہو، اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ ان کو اس طرح چھوڑا جائے کہ محتاج ومفلس ہوں اور ان کی زندگی دوسروں کے رحم وکرم پر رہ جائے۔

کتب احادیث وسیر میں اس قسم کے متعدد واقعات مذکور ہیں ہم نے یہاں صرف تمثیل پر اکتفا کیا ہے سفیان ثوریؒ بہت بڑے کاروباری آدمی تھے، لیث بن سعدؒ ہر سال کم سے کم بیس ہزار کا کاروبار کرتے تھے۔ ابن مہدیؒ کی تجارت میں ہزاروں اشرفیاں لگی ہوئی تھیں، امام اعظم ابی حنیفہؒ کا کاروبار لاکھوں روپیہ کا تھا، ان کے اسی کاروبار کے طفیل کتنے ہی علماء خدمتِ حق کے لائق ہوئے یہاں تک کہ اُمت نے منصب امامت ان کے سپرد کیا۔ غرضکہ وسائلِ معیشت کی جستجو اور اُن وسائل کے مطابق عمل کرنا سلف صالح کی عام عادت تھی اور وہ اسے عین توکل خیال کرتے تھے۔

تفصیل کا یہ موقع نہیں، ورنہ اس سلسلہ میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں نام پیش کیے جاسکتے ہیں۔ اتنی تفصیل بھی اس لیے کی گئی ہے کہ اہلِ علم اس سے سبق حاصل کریں اور اُن کو معلوم ہوجائے کہ اُن کے بزرگوں کا اسوہ حسنہ کیا ہے، کیا یہ ہے جو بعض غلط کار وغلط اندیش مدعیانِ تصوف نے اختیار کر رکھا ہے کہ بغیر حقیقت پر

غور کیے الدنیا اھون علی اللہ من شاۃ میتۃ علی اھلھا کی رٹ لگاتے پھرتے ہیں اور وما الحیٰوۃ الدنیا الا متاع الغرور کے بے محل وعظ کہہ کہہ کر خدا کی مخلوق کے قوائے عمل کو مضمحل کر رہے ہیں یا یہ ہے جس کا ذکر سطورِ فوق میں ہوا، ہاں اہل دین اور اہل دنیا کے درمیان جو حدِ فاصل ہے وہ یہ ہے: اہل دنیا دنیا کو مقصود سمجھتے ہیں اور اسی وجہ سے اس میں غرق ہوتے ہیں۔ اس کے بالمقابل اہل دین کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ ذرائع معاش اور تحصیل دولت کے میدان میں کسی سے پیچھے نہیں رہتے لیکن جب اپنی محنت سے حاصل کی ہوئی دولت کے لٹا دینے کا وقت آتا ہے تو بے تامل لٹا دیتے ہیں[3]۔

ہاں تو ذکر یہ تھا کہ سمجھ کی بات یہ ہے دولت پیدا کرنے کی اور حاصل شدہ دولت کی حفاظت کی کوشش کی جائے۔ علی الخصوص علماء کو تو اس کا بہت ہی خیال رکھنا چاہیے۔ میں نے ایسے بہت سے اہل علم کو دیکھا ہے کہ پہلے تو تحصیلِ علم کی مصروفیتوں نے انہیں کسب واکتساب سے بے تعلق رکھا اور ان کو اس منزل میں قدم رکھنے کا موقع ہی نہیں ملا لیکن جب ان کے مصارف بڑھے اور ضروریات کے لیے انہیں روپیہ کی ضرورت پیش آئی تو ان کے سامنے اس حسرتناک منظر کے سوا کچھ نہیں تھا کہ سوسائٹی میں

---

(۱) مردار بکری کی جو قیمت اور جو وقعت ہو سکتی ہے خدا کے یہاں دنیا اس سے بھی ہلکی اور بے وزن ہے۔

(۲) دنیا کارخانہ فریب کے سوا اور کچھ نہیں۔

(۳) اس باب میں صدیق اکبرؓ کا واقعہ بطور اساس کے سامنے رکھنا چاہیے۔ غزوۂ تبوک کی مہم میں جب انہوں نے راہ حق میں اپنا تمام مال ومتاع پیش کر دیا تو ان سے دریافت کیا گیا:۔

ما ابقیت لاھلک (اپنے متعلقین کے لیے کیا چھوڑ آئے ہو؟) اس پیکر اخلاص ورضا نے جواب دیا: ابقیت لھم اللہ ورسولہ۔ (اللہ اور اللہ کے رسول کو)

اللہ اکبر کیا یہ وہی صدیق اکبرؓ ہیں جو اپنے کاروبار کی ترقی اور دولت کی تحصیل کے لیے طول طویل سفر کرتے تھے

آنکس کہ ترا بخواست جاں را چہ کند　　فرزند وعیال وخانماں را چہ کند
دیوانہ کنی ہر دو جہانش بخشی　　دیوانۂ تو ہر دو جہاں را چہ کند

تحصیلِ دولت اور اس کو مصرف صحیح میں خرچ کرنے کا مسئلہ تفصیلات کا طالب ہے، یہاں ہم نے صرف چند اشارات پر اکتفا کیا ہے۔

اُن کی اور اُن کے علم کی کوئی وقعت نہیں، عام لوگوں کی نظر میں وہ ذلیل ہیں، اُن کی اعانت کے لیے یا تو کوئی آمادہ نہیں ہوتا، ہوتا ہے تو یہ سمجھ کر کہ وہ ایک محتاج اور گرے ہوئے طبقہ کی اعانت کر رہا ہے، حالانکہ اہل علم ہی ہر طرح کی عزت افزائیوں کے مستحق ہیں۔ پہلے زمانہ میں تو یہ صورت تھی کہ اہل علم وفضل کی ضرورتیں بیت المال سے پوری کی جاتی تھیں اور انہیں دوسروں کا رہین احسان ہونا نہیں پڑتا تھا۔(۱) اب جبکہ وہ صورت باقی نہیں رہی۔ ادھر ذرائع معاش کا پہلے سے فقدان، تو اب کیفیت یہ ہوگئی ہے کہ کسی متدین کے لیے یہ ممکن ہی نہیں رہا کہ دین ودیانت کے کسی حصہ کو قربان کیے بغیر وہ کچھ حاصل کر سکے، اور اے کاش اس طرح ہی اُس کی ضرورت پوری ہو جاتی، مگر نہیں ہوتی بلکہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ دین میں بھی رخنہ پڑتا ہے، دیانت بھی رخصت ہوتی ہے اور ملتا کچھ بھی نہیں۔

پس ہر اُس شخص کے لیے جس کے دماغ میں عقل وفہم کی کچھ بھی روشنی باقی ہے یہ ضروری ہے کہ اپنی دولت کی حفاظت کرے اور بہتر سے بہتر ذرائع کسب اختیار کرنے کی کوشش، ایسا نہیں کریگا تو محض روزی کے لیے یا ظالم کی مدارات کرنی پڑیگی یا جہل کی چوکھٹ پر علم کو جھکنا پڑیگا۔(۲)

یاد رکھو آج کل کا رسمی فقر صرف عجز کی دوسری تعبیر ہے، کبھی اس تعبیر سے دھوکا نہ کھانا، کسب واکتساب کا پہلا قدرتی اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان دینے والا اور صدقہ کرنے والا بنتا ہے لینے والا اور خیرات کھانے والا نہیں بنتا، ظاہر ہے اس مرتبہ کی قدر ومنزلت سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ لوگ جسے فقر سمجھتے ہیں اور اُس پر

(۱) علامہ ابن جوزی چھٹی صدی ہجری میں یہ نصیحتیں کر رہے ہیں حالانکہ وہ زمانہ بڑی حد تک اسلامی عروج وسطوت کا زمانہ ہے، علامہ موصوف ہمارے دور میں ہوتے تو کیا رائے قائم کرتے؟

(۲) نوابوں اور امیروں کے محلوں میں فضیلت کی دستاروں اور علم کے جبّوں کی جو توہین ہو رہی ہے اس موقع پر اُس کا نقشہ آنکھوں میں جما لینا چاہیے۔ اہل علم دولت والوں کے گھروں کے طواف کے لیے کیوں مجبور ہیں، صرف اس لیے کہ علم کے ساتھ اُنھوں نے ذرائع معاش کی تحصیل کی طرف توجہ نہیں کی نہ صرف یہ کہ توجہ نہیں کی بلکہ اپنا پہلا اندوختہ بھی جوش میں آکر ضائع کر بیٹھے۔ اچھا اب اگر اپنے خیال میں اس راہ کو توکل کی راہ سمجھ رہے تھے تو اُسی پر قائم رہتے، مگر یہ بھی نہیں ہوتا۔

تعلیماتِ شریعت کو منطبق کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں حقیقت میں وہ ایک روگ ہے جس کا شکار وہ کم ہمت اور پست ارادہ لوگ ہوتے ہیں جن کے قوائے کسب و عمل پر پالا پڑچکا ہے اور جو بے کار پڑے کہتے رہتے ہیں۔ سیأتینی رزقی (میری روزی اب آئی اور جو مقدر ہے وہ تو ہوکر ہی رہیگا)

جس شخص کو ان حقائق پر غور کرنے کی توفیق ہوگی وہ مقامِ غنیٰ کی بلندی کا اندازہ کرسکیگا۔ یعنی اُسے معلوم ہوگا کہ اپنے کسب اور اپنی محنت و کاوش سے حاصل کی ہوئی روزی کی حیثیت کتنی اونچی ہے اور فقر کی وہ منزل جہاں انسان دوسروں کا محتاج ہو جائے کس قدر پست اور پُرخطر منزل ہے۔

قومی زبان

از پروفیسر مولانا یعقوب الرحمٰن عثمانی

اس رسالہ میں دلائل کی روشنی میں یہ بحث کی گئی ہے کہ قومیتِ مشترکہ کے قیام کے لیے ایک ایسی زبان کی ضرورت ہے جو ہندوستان کے ہر خطہ میں بولی یا سمجھی جاتی ہو اور جس کی تعمیر میں ہندوستان کی مختلف قوموں نے حصہ لیا ہو۔ نیز ثابت کیا گیا ہے کہ مقبولیت و وسعت، اشاعت و طباعت کی سہولت تلفظ کی شیرینی اور دوسری خصوصیات کے لحاظ سے ہندوستان کی مشترک زبان صرف اُردو ہو سکتی ہے۔ اس کے ساتھ ان اعتراضوں کو نہایت سلجھے ہوئے پیرایہ میں رد کیا گیا ہے جو اُردو زبان پر کیے جاتے ہیں۔ غرضکہ مؤلف نے اس چھوٹے سے رسالہ میں نہایت ہی دلنشین انداز بیان کے ساتھ یہ واضح کیا ہے کہ اُردو زبان اپنی خصوصیتوں کے اعتبار سے نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کی بہترین زبانوں میں ہے۔ ۵ر کے ٹکٹ بھیج کر طلب فرمائیے۔ پتہ:- منیجر مکتبہ برہان قرول باغ نئی دہلی۔